یکم ستمبر ۱۹۶۹ء

REGD. No L. 922
R.No 2186/57.

ہفتہ وار

ہماری زبان

ایڈیٹر: آل احمد سرور

اِس شمارے میں

آل احمد سرور

مخدوم محی الدین

جولائی کے آخر کی بات ہے۔ سری نگر میں ریڈیو پر مشاعرہ تھا۔ مخدوم اسی سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ میں بھی اس زمانے میں توسیعی لیکچر دینے کے لئے گیا ہوا تھا۔ ریڈیو کے مشاعرے کے علاوہ گاندھی جینتی کے سلسلے میں ایک اور مشاعرہ ہوا۔ پھر یہ طے کیا گیا کہ باہر سے جو شعرا آئے ہوئے ہیں وہ اور کشمیر کے ممتاز شعرا اچھا بل، بانڈی پور اور سوپور میں بھی مشاعروں میں اپنا کلام سنائیں۔ غرض کوئی ایک ہفتے تک ان کا ساتھ رہا۔ شعر و شاعری، ادبی مسائل، ملکی سیاسیات، تلنگانہ تحریک، سبھی پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ مخدوم کو دیکھ کر یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد، تپا ہوا سیاہ رنگ، ترشے ہوئے خد و خال کسی طرح پچاس پچپن سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں ان کا ساٹھ سالہ جشن منایا گیا تھا۔ میں نے پوچھا بھائی یہ کیا قصہ ہے۔ لوگ اپنی عمر کم بتاتے ہیں تم اپنی عمر زیادہ بتاتے ہو۔ اتنی جلد ساٹھ سالہ جشن منا لیا۔ کہنے لگے جناب میں آپ سے کم سے کم چار پانچ سال بڑا ہوں، ہاں ویسے آپ کو بڑا مانتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ کچھ دن کے لئے علی گڑھ آؤ تاکہ اطمینان سے ادبی مسائل پر بات چیت ہو۔ کہنے لگے ضرور آؤں گا۔ دلی کے پھیرے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہاں سے علی گڑھ کیا دور ہے۔

مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ مخدوم ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے کے سلسلے میں دلی آئے ہوئے تھے۔ ۲۴ کو صبح ان پر دل کا دورہ پڑا۔ فوراً ارون اسپتال میں داخل کر دئے گئے۔ خیال تھا کہ خطرے کے چند دن گزر جائیں تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ مگر ۲۵ کی شام کو دوسرا سخت دورہ ہوا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ ۲۶ کو دن کے ہوائی جہاز سے ان کی لاش حیدرآباد لے جائی گئی اور شب میں ہزاروں سوگواروں کے ہجوم میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ صرف حیدرآباد کے لوگ ہی نہیں، ساری اردو دنیا ان کی سوگوار ہے۔

مخدوم ہمارے صف اول کے شاعروں میں تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ میں حیدرآباد میں مولوی عبدالحق صاحب کے یہاں مقیم تھا۔ مخدوم اس زمانے میں بھی اپنی سحر انگیز نظموں اور سیاسی و ادبی تحریکوں میں گہری دلچسپی کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ شروع سے کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے۔ اپنے مسلک کے لئے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں اور بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ برسوں تلنگانہ تحریک کے سلسلے میں روپوش رہے۔ قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں۔ مگر چونکہ ان کے یہاں عقیدے کی پختگی اور کردار کی استواری تھی، اس لئے ان کے مزاج کی شگفتگی اور قلب کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ سب سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ نہ کسی پر اپنے سیاسی عقائد ٹھونسنے کی کوشش کرتے تھے، نہ کسی پر طنز کرتے تھے، نہ اپنی ہمہ دانی کا رعب ڈالتے تھے، نہ ادبی اختلافات کی وجہ سے ذاتی تعلقات پر آنچ آنے دیتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور دانشور بھی اور بڑے مخلص آدمی تھے۔ مخدوم کی شروع کی نظموں میں خطابت یا بیانیہ انداز خاصا نمایاں ہے۔ مگر جا بجا اچھی اور حقیقی شاعری ملتی ہے۔ شاعری میں معشوق کی اہمیت نہیں ہوتی عاشق کی اہمیت ہوتی ہے۔ محبوب کیسا ہی ہو دیکھنا یہ چاہئے کہ عشق کیسا ہے۔ اس میں کتنی گرمی ہے، کتنی تڑپ، کتنا سوز و گداز اور پھر یہ سوز و گداز شعر بنا ہے یا نہیں۔ تجربہ سچا ہے یا کچا۔ مخدوم اس لئے اچھے شاعر نہیں تھے کہ وہ کمیونسٹ تھے۔ شاعر کمیونسٹ بھی ہو سکتا ہے، سوشلسٹ بھی، آدرش وادی بھی، رومانی بھی۔ اقبال اور ایلیٹ کے یہاں ایک گہرا مذہبی عقیدہ ہے۔ مخدوم کے یہاں مارکسزم پر گہرا عقیدہ ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ مذہبیت یا مارکسزم کی وجہ سے شاعری بڑی نہیں ہوتی اور بڑی شاعری مذہبی بھی ہو سکتی ہے اور مارکسی بھی۔ یہ وہی پیچ عشق کی بات ہے۔ مخدوم نے اسٹالین پر ایک نظم لکھی تھی۔ جب ۱۹۵۱ء میں پہلی دفعہ دلی ریڈیو سے یہ نظم نشر ہوئی تو سب کو اس نے متاثر کیا۔ اب اسٹالین کے رول کا بھی علم ہو چکا ہے۔ خروشچیف کے بیان کے بعد اور بھی بہت کچھ مواد سامنے آ چکا ہے۔ مگر مخدوم کی نظم کی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے اس لئے کہ یہ نظم ہے تاریخ نہیں ہے۔ اس کی

اپنی صداقت ہے۔ اسی طرح فیض کی نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" ایک خوبصورت نظم ہے اور اس کی خوبصورتی کے اعتراف کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جولیس اور ایتھل روزنبرگ کے دردِ دل کو بھی قصہ بنایا جائے۔ یہ بھی کچھ عاشقوں کی داستان ہے۔ سرخ سویرا سے گل تر تک اور گل تر سے بساط رقص تک مخدوم کے فن میں بہت ارتقا ہوا۔ انھوں نے چاند تاروں کا بن جیسی نظم لکھی جو میرے نزدیک فیض کی نظم یہ داغ داغ اجالا کے ساتھ آزادی پر اردو کی بہترین نظم ہے۔ انھوں نے چارہ گر، بلور، سناٹا جیسی حسین نظمیں لکھیں اور چند نہایت بانکی غزلیں جو غزل کے ہر انتخاب میں ضرور جگہ پائیں گی۔ ان کی آخر دور کی نظموں میں خطابت یا براہ راست اظہار کے بجائے بالواسطہ یا شاعرانہ اظہار ہے۔ ان کے یہاں بڑی غنائیت پائی جاتی ہے۔ ان کی فکر آخر تک جوان رہی۔ انھوں نے اپنے کو دہرایا نہیں۔ وہ جدید میلانات کا خاموش اثر برابر قبول کرتے رہے۔

اور یہ معمولی بات نہیں تھی کہ مخدوم کا شعر پڑھنے کا انداز بڑا دلکش تھا۔ میں نے کشمیر میں ایک مشاعرے میں ان سے کہا تھا کہ مخدوم تم واقعی جادوگر ہو۔ بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے بچپن میں مجھے قرأت سکھائی گئی تھی۔ یہ اس کا فیضان ہے۔ میں نے بلا مبالغہ چالیس پچاس دفعہ مخدوم کو سنا ہوگا۔ نئی نظمیں کم سننے کا اتفاق ہوتا تھا، زیادہ تر پرانی نظمیں سننے کو ملتی تھیں۔ مگر ہر بار ایک نیا لطف اور ایک نیا کیف محسوس ہوتا تھا۔ مخدوم واقعی سدا بہار تھا اور مرنے کے بعد بھی سدا بہار رہے گا۔ عاشق رخصت ہو جائے پھر بھی اس کا عشق زندہ و تابندہ رہتا ہے۔

مخدوم محی الدین کی وفات پر

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تعزیتی تجویز

۲۶ اگست ۱۹۶۹ء۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کا یہ جلسہ اردو زبان کے ممتاز اور بلند پایہ شاعر مخدوم محی الدین کی اچانک وفات پر اپنے گہرے رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ اور اسے اردو زبان و ادب کے لئے ایک بڑا سانحہ تصور کرتا ہے۔

مخدوم نہ صرف یہ کہ ہماری زبان کے ایک اہم اور قابل قدر شاعر تھے بلکہ ان کا شمار ہمارے ملک کے دانشوروں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک سچے قوم پرست، محب وطن اور ہر دلعزیز عوامی رہنما تھے۔ اپنے عنفوان شباب کے دور میں ہی جب کہ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے انھوں نے حیدرآباد کی سماجی و تہذیبی زندگی میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ دنوں وہ اردو زبان و ادب کے ایک معلم کی حیثیت سے کام کرتے رہے مگر بہت جلد عملی سیاست میں قدم رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک انقلابی ذہن رکھتے تھے اور ان کے اندر ایک مجاہدانہ عزم اور سرفروشی کا جذبہ تھا۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں انھیں سالہا سال قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

وہ ایک پرخلوص انسان تھے اور ان کی شخصیت میں ایسی دلنوازی تھی کہ کوئی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اپنے سیاسی اور ادبی معتقدات پر ان کا ایمان اس قدر مستحکم تھا کہ کوئی ترغیب و تحریص انھیں متزلزل نہ کر سکتی تھی۔ یہی خلوص ان کے فن کی اساس تھا۔

مخدوم نے سرخ سویرا سے گل تر اور بساط رقص تک اپنے فن کی کئی منزلیں طے کیں۔ ان کی شاعری میں مسلسل ارتقا ملتا ہے ان کی حالیہ نظموں میں دور حاضر کے مسائل کا جو گہرا شعور اور ان کے انداز بیان میں جو تازگی اور ندرت ملتی ہے اس کا سبھی اعتراف کرتے ہیں۔

مخدوم کے انتقال سے ہماری ادبی و تہذیبی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو دیر تک پر نہ ہو سکے گا۔

ہم مرحوم کے پسماندگان اور متعلقین کے غم میں شریک ہیں اور دست بدعا ہیں کہ ان کی روح کو سکون نصیب ہو۔

صابرہ زیدی کی وفات پر

انجمن مینا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا جلسۂ تعزیت

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادیبوں کی انجمن مینا کے زیر اہتمام ایک تعزیتی جلسہ مس صابرہ زیدی کی وفات پر ۱۳ راگست ۱۹۶۹ء کو منعقد ہوا جس میں وحید اختر، اسد بدایونی، خلیل الرحمٰن اعظمی، مس زاہدہ زیدی، مسز ساجدہ زیدی اور قاضی عبدالستار نے شرکت کی حسب ذیل تعزیتی تجویز منظور کی گئی۔

ہم اراکین مینا کو مس صابرہ زیدی کے اچانک انتقال پر دلی صدمہ ہے مس صابرہ زیدی ہماری انجمن کی سرگرم کارکن تھیں انھوں نے اپنی پوری زندگی علمی و ادبی کاموں کے لئے وقف کر دی تھی ان کی جو کتابیں چھپی ہیں وہ علمی دنیا میں بلند معیار کی حامل سمجھی جاتی ہیں اپنے مخصوص دائرۂ علم (فلسفہ اور تعلیم) کے علاوہ انھوں نے مغرب کے کئی شاعروں مثلاً ناظم حکمت اور پبلو نرودا وغیرہ کو پہلی بار اردو کے حلقوں سے متعارف کرایا اس کے علاوہ انھوں نے روسی ادب کی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔

اگرچہ موصوفہ ادبی سرگرمیوں اور ہنگاموں سے دور رہتی تھیں لیکن خاموشی سے آخر وقت تک اپنے تحقیقی اور علمی کاموں میں بیماری کے باوجود مصروف رہیں۔ انھوں نے جو کام ادھورا چھوڑا ہے وہ بھی خاصا اہم ہے ہماری خواہش ہے کہ اسے یونیورسٹی یا کوئی ادارہ ترتیب دے کر شائع کر دے تو یہ علم و ادب کی بڑی خدمت ہوگی اور مرحومہ کو یاد رکھنے کا بہتر وسیلہ ہوگا۔

مس صابرہ زیدی کی مفارقت سے علمی دنیا کے علاوہ علی گڑھ کے ادیبوں کو خاص طور سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے ہم مرحومہ کے عزیزوں اور قریبی دوستوں کے ساتھ اس صدمہ میں برابر کے شریک ہیں اور دست بدعا ہیں کہ خدا انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔

● وارث کرمانی کنوینر

راز چاندپوری کا انتقال

ادبی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر جناب راز چاندپوری کا ۲۵ راگست ۱۹۶۹ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ادارہ ہماری زبان اس سانحہ پر پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

نظیر صدیقی

شادانی صاحب

شادانی صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ ڈھاکے میں گزرا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں وہ یہاں آگئے اور مئی ۱۹۶۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر جولائی میں وہ ڈھاکے کو خیرباد کہنے والے تھے۔ اس کا علم ان کے بھی جاننے والوں کو تھا البتہ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ ڈھاکے کو خیرباد کہنے کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی خیرباد کہہ جائیں گے موت سے زیادہ ناگزیر اور زندگی سے زیادہ غیر یقینی شے دنیا میں کوئی اور نہیں۔

شادانی صاحب کی وفات سے علم و ادب، شعر و سخن اور تہذیب و ثقافت کی دنیا میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جو شخص کم و بیش چالیس سال تک اپنے معاشرے کی علمی، ادبی، شعری اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا ہو اور نمایاں کردار ادا کرتا رہا ہو اس کے اٹھ جانے سے ان تمام شعبوں میں خلا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں شادانی صاحب کے باب میں یہ مصرع دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ فی الواقع بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی شخصی اور ادبی خوبیوں کا مکمل ذکر ایک طویل مضمون کی وسعت چاہتا ہے یہاں مختصراً اتنا کہنے کی گنجائش ضرور ہے کہ وہ ایک خوش اخلاق خوش گفتار اور مجلس آرا انسان تھے۔ وہ ہر کس و ناکس سے گھل مل جانے کے قائل تو نہ تھے لیکن ان تک ہر کس و ناکس کی رسائی آسان تھی۔ وہ خدمت خلق کے لئے وقف تو نہ تھے لیکن بیشتر معاملات میں حتی المقدور دوسروں کے کام ضرور آتے تھے۔ وہ تکلف کے قائل نہ تھے لیکن بے تکلفی میں حد ادب کے قائل ضرور تھے۔ انھیں ہنسنے ہنسانے سے دلچسپی ضرور تھی لیکن ہنسنے ہنسانے میں سنجیدگی اور شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ تھے بذلہ گوئی اور بذلہ سنجی ان کی طبیعت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ وہ طبع زاد فقرے کم چست کرتے تھے لیکن لطیفے ہمیشہ نئے اور نہایت دل چسپ سناتے تھے۔ اگرچہ وہ دوسروں کی اہمیت اور عظمت کو مشکل سے تسلیم کرتے تھے لیکن اپنی اہمیت کو تسلیم کرانے کے درپے نہیں رہا کرتے تھے۔ تقریر اور تحریر دونوں کے دھنی تھے۔ اسی طرح نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور ادب کی ان دونوں صنفوں میں ان کی کارکردگی منفرد خوبیوں کی حامل ہے۔

شادانی صاحب کی مجلسی خوبیوں میں ان کی خوش گفتاری اور بذلہ سنجی کے علاوہ ان کی بدیہہ گوئی بھی قابل ذکر ہے وہ یقیناً اپنے زمانے کے بہترین بدیہہ گویوں میں سے تھے۔ ان کی بدیہہ گوئی شاعروں میں رنگ لاتی تھی میں نے شاعروں میں ان سے بہتر شاعروں کا منظوم تعارف کرانے اور ان پر منظوم تبصرہ کرتے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی بدیہہ گوئی پر قدرت رکھتے تھے جب کبھی ایران گئے تو اپنی اس صلاحیت کی بدولت انھوں نے بارہا اپنے آپ کو شہنشاہ ایران اور وہاں کے وزراء، امرا اور شعرا کی توجہ کا مرکز بنا لیا۔

قدرت نے شادانی صاحب کو مختلف قسم کی صلاحیتوں کے عطا کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ البتہ شادانی صاحب نے اپنی تمام صلاحیتوں سے پورے طور پر فائدہ اٹھانے میں بخل سے کام لیا۔ اس کے باوجود وہ گزشتہ تیس پینتیس سال سے برصغیر ہند و پاک کے مشہور و ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے رہے۔

شادانی صاحب نے بھرپور زندگی گزاری۔ انھیں اپنی زندگی کے ہر دور میں امتیاز و اعزاز نصیب ہوا۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ انھیں مرتے دم تک اعزاز نصیب ہوتا رہا۔ آخری اعزاز یعنی پروفیسر ایمی ریٹس کا عہدہ انھیں بستر علالت پر نہیں بستر مرگ پر ملا۔ نہ جانے انھیں اس کے ملنے کی خوش خبری سنائی جا سکی یا نہیں۔

(باقی صفحہ ۴ پر)

۲۵ راگست ۶۹ء

کی شام کو نئی دہلی کے ارون اسپتال میں حرکت قلب بند ہو جانے سے، بعمر ۶۲ سال مخدوم محی الدین کا انتقال ہو گیا۔

ادارہ ہماری زبان اس سانحے پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

میں

تھک کے رہ جاتے ہیں استدلال کے جس جا قدم
ٹوٹ جاتا ہے پہنچ کر جس جگہ منطق کا دم

خواب عقل و ہوش کی مجبول تعبیروں سے دور
فلسفی کی "کس طرح" اور "کیوں" کی زنجیروں سے دور

میرے رہنے کا جہان جاودانی اور ہے
دل کی دنیائے نہاں کی زندگانی اور ہے

خود تراشیدہ بت ناز آفریں میرا وجود
میری ذات پاک مسجود جہان ہست و بود

دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں رہتا ہوں میں
اپنے سیلاب خودی میں آپ ہی بہتا ہوں میں

میرے سجدوں کے لئے ہی وقف ہے میری جبیں
میری اقلیم انا میں دوسرا کوئی نہیں

مخدوم محی الدین

اقبال کرشن

اردو ڈائری

ستمبر کی ستم رانیاں اور گہر افشانیاں

۷۔ وفات مانی جائسی ۱۹۴۳ ۔ وفات نواب صدیق حسن ۱۹۰۳ء

۹۔ وفات جگر مرادآبادی ۱۹۶۰۔ وفات اختر شیرانی ۱۹۴۸۔ وفات اکبر الہ آبادی ۱۹۲۱۔

۱۰۔ وفات حیرت لکھنوی ۱۹۶۴۔

۱۲۔ وفات منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی ۱۹۱۳۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کا انتساب لکھا ۱۹۳۱۔ ولادت ممتاز شیریں ۱۹۲۰۔

۱۸۔ ولادت تجوید بدایونی ۱۸۸۸۔

۲۰۔ ولادت ڈاکٹر گیان چند ۱۹۲۳۔ وفات حبیب اللہ خاں صفائی ۱۹۶۰۔

۲۱۔ وفات اکرام حسین صاحبزادہ حالی ۱۹۲۵۔ ولادت ضیا احمد بدایونی ۱۸۹۴۔

۲۳۔ وفات ڈاکٹر زور ۱۹۶۲۔

۲۶۔ وفات نصیر الدین ہاشمی ۱۹۶۴۔

۲۷۔ وفات راجہ رام موہن رائے ۱۸۳۳۔

۳۰۔ وفات جلال لکھنوی ۱۹۰۹۔

اکتوبر ـــــ ماہ سرسید

۱۔ نظامی بدایونی نے دیوان درد میں گذارش لکھی ۱۹۳۲۔

۲۔ وفات مائل دہلوی ۱۹۲۱۔

۷۔ وفات محسن الملک ۱۹۰۷۔ وفات پنڈت زار زتشی دہلوی ۱۹۶۵۔

۸۔ وفات فانی اجمیری ۱۹۶۲۔ وفات پریم چند ۱۹۳۶۔ روزنامہ ہمدرد دہلی میں حالی کی ۳ رباعیاں کانپور مسجد سے متعلق شایع ہوئیں۔

۹۔ وفات سیف الدین کچلو ۱۹۶۳۔

۱۱۔ وفات سراج دھولپوری ۱۹۶۳۔ ولادت کلیم احمد عاجز ۱۹۲۶

۱۳۔ وفات نوح ناروی ۱۹۶۲۔ وفات شاعر لکھنوی ۱۹۶۲۔

۱۷۔ ولادت سرسید احمد خاں ۱۸۱۷۔

۲۴۔ پنجابی اخبار میں حالی کی نظم حب وطن شائع ہوئی ۱۸۷۴۔

۲۶۔ اسماعیل پانی پتی نے تذکرہ حالی کی تمہید لکھی ۱۹۲۵۔

۲۹۔ وفات جہانگیر ۱۶۲۷۔ وحید اختر کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ۱۹۶۰۔

صفحہ ۳ سے آگے

شادانی صاحب نے چاند اور چاندنی سے متعلق اشعار اردو کے دوسرے تمام شاعروں سے زیادہ کہے ہیں اور بہتر کہے ہیں۔ اسی لئے ان کے ایک نقاد نے ان کو شاعر ماہ تاب قرار دیا تھا۔ لیکن غالباً شاعر ماہ تاب کو اس بات کی خبر نہ ہو سکی کہ ان کی زندگی کے آخری دنوں میں انسان چاند تک پہنچ گیا۔

شادانی صاحب کی شخصیت اور کارکردگی ہمارے قومی ورثے کا جزو بن چکی ہیں۔ وقت آنے پر دونوں چیزوں کی قدر و قیمت بھی متعین کی جائے گی اور ان کے کھرے کھوٹے کا محاسبہ بھی کیا جائے گا۔ ان کی ذات سے جو ادبی ورثے ہمیں ملے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رایوں اور فیصلوں کی تشکیل میں بے لاگ انداز سے کام لیا جائے۔

شادانی صاحب سے میرے تعلقات ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک رہے۔ اس کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر مجھے ان سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ لیکن میری یہ علیحدگی ان کی خوبیوں کے اعتراف و اظہار میں کبھی مانع آئی ہے نہ آ سکے گی۔

صفحہ ۶ سے آگے

تا بدل عشق ماہ خد باشد　　چوں کتاں خاک بے عدد باشد

(یحییٰ علی خاں)

تجھ پہ جو سفتوں کہاں زہرہ دل بیتاب کا　　آگ کا شعلہ ہے تو قطرہ ہے سیماب کا

(صفدر حسین)

ہے یار پاس ذکر ہے چنگ و رباب کا　　ساقی شتاب دے کوئی ساغر شراب کا

(آغا حسین)

تا دیا تی نہ رہے جیب کا اور دامن کا　　جسم سے قطع ہو رشتہ کہیں پیراہن کا

(سخاوت علی)

●●

احمر لاری

اخبارِ حسینی

اردو صحافت کی تاریخ میں آگرہ کو خاصا اہم مقام حاصل ہے یہاں سے سب سے پہلا اردو اخبار سی ڈنگ نے "صدر الاخبار" کے نام سے ۱۸۴۹ء میں نکالا[1] ۱۸۵۵ء تک اس سرزمین سے کم از کم گیارہ اردو اخبار جاری ہو چکے تھے ۱۸۵۵ء میں مزید سات اخبار (۱) تفریح الناظرین (۲) سفیر آگرہ (۳) مفید الخلائق (۴) معلم العلما (۵) معدن المفوائین (۶) اخبار حیدری (۷) اخبار حسینی جاری ہوئے۔ آخر الذکر دو اخباروں کے کچھ شمارے راقم السطور کو گورکھپور کے ایک ذاتی کتب خانے میں ملے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اب تک ان اخباروں کے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ بڑی حد تک تشنہ اور نامکمل ہیں۔ اس سے قبل راقم السطور اخبار حیدری کا تفصیلی تعارف کرا چکا ہے (ہماری زبان شمارہ ۱۵ مارچ و ۲۲ مارچ ۱۹۶۹ء) اس وقت اخبار حسینی کا تعارف مقصود ہے۔

اس اخبار کے آٹھ شمارے ۵ اپریل تا ۲۲ مئی ۱۸۵۵ء پیش نظر ہیں۔ اخبار کے پہلے صفحے کا بالائی نصف سے کچھ کم حصہ نائٹل کے لئے وقف ہے۔ پہلے یہ قطعہ درج ہے:

شاداب ہمیشہ سے ہے گلزار حسینی
کیونکر نہ ترقی پہ ہو اخبار حسینی
امداد کو حیدر ہیں شفاعت کو محمدؐ
قسمت سے ملی ہے ہمیں سرکار حسینی

اس کے بعد پھول پتیوں کے درمیان جلی قلم سے "اخبار حسینی" لکھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے نمبر شمار، تاریخ اور روز اشاعت، جلد نمبر اور قیمت درج ہے آخری صفحہ پر پرنٹ لائن میں یہ عبارت ملتی ہے "مطبع حسینی آگرہ میں باہتمام سید حسین علی چھاپا گیا"۔ اخبار دو کالمی ہے اور ۲۰×۱۳ " سائز کے سفید کاغذ پر چھپا ہوا ہے۔ صفحات کی تعداد معین نہیں۔ بعض شمارے ۸ صفحات کے ہیں اور بعض ۱۲ صفحات کے۔ ۵ اپریل کے شمارے پر جلد ۲ نمبر ۱۴ درج ہے جس سے یہ بات ظاہر ہے کہ یہ اخبار ۱۸۵۴ء میں جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور ہر اتوار کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے مہتمم (اڈیٹر) سید حسین علی تھے اور اس دور کے بیشتر اخباروں کی طرح یہ اخبار بھی صاحب مطبع تھا۔

اس اخبار کا ذکر سب سے پہلے خطبات گارساں دتاسی میں ملتا ہے۔ دتاسی لکھتا ہے:

"اخبار حیدری اور اخبار حسینی دونوں اردو کے اخبار ہیں۔ پہلے کے مدیر مرزا علی حسین حیدری ہیں اور دوسرے کے سید حسین علی جو دلی کالج میں پروفیسر ہیں اور انھوں نے الف لیلہ کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔"[1]

دتاسی کے بیان سے نہ آغاز اجرا اور وقفہ اشاعت پر روشنی پڑتی ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار کہاں سے نکلتا تھا۔ خطبات دتاسی کے بعد اس کا ذکر اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف کی تالیف "اختر شاہنشاہی" میں ملتا ہے:

"حسینی، آگرہ محلہ کڑہ حاجی حسن مرحوم مالک حسین علی اجرائے ۱۸۵۴ء"[2]

موجودہ دور میں مولانا امداد علی صابری اس اخبار کے متعلق "تاریخ صحافت اردو" جلد دوم میں رقمطراز ہیں:

"اخبار حیدری و اخبار حسینی یہ دونوں اخبار ۱۸۹۱ء میں نکلے تھے۔۔۔ ۔۔۔۔ (ورقہ ۲۳۲) اخبار حسینی کے ایڈیٹر مولوی حسن علی خاں تھے جو دہلی کالج کے فارسی جماعت کے مدرس تھے بہت قابل اور ہوشیار شخص تھے، قانون دا(ں)

[1] محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۹۱

[1] خطبات گارساں دتاسی ص ۲۶۰

[2] اختر شاہنشاہی، ص ۱۰۱

عزیز اندوری

فاتح

(چاند پر انسان کی پہلی شاندار کامیابی کے بعد)

وہ اک تجسس پیہم جہاد کہئے جسے
وہ اک نگاہ جسے عزم کا مزاج کہئے
وہ اک خیال جسے کہئے فتح سے تعبیر
وہ اک خلوص جسے دل کا ترجماں کہئے
وہ ایک نشہ جسے کہئے کیفِ روحانی
وہ اک سرور جسے کیف دو جہاں کہئے
وہ ایک جذبۂ بے دار کہئے جس کو وجود
وہ اک عمل جسے اک عزم جاوداں کہئے
وہ اک یقین جسے کہئے۔ فاتح عالم
وہ اک امید جسے فتح کا نشاں کہئے

●

نہ جانے کتنے خیالات ذہن انساں میں
بنا رہے تھے نئے دور کی نئی تصویر

●

سوال عظمت انساں کی جستجو کا تھا
سوال "دورِ ترقی" کی آبرو کا تھا
سوال اک نئی منزل کی آرزو کا تھا

●

خوشی مناؤ! کہ انساں کے عزم کامل نے
ہر ایک منزل دشوار کو عبور کیا
بہت ہی سخت تھا وہم و گماں کا آئینہ
ہزار شکر کہ انساں نے اس کو چور کیا

گلستان سعدی اور الف لیلےٰ کا ترجمہ اردو میں کیا، اور پرنسپل صاحب کی فرمائش سے کرۂ ارضی کا بھی ترجمہ فرمایا اور یہ سب کتابیں سوسائٹی نے طبع کرائیں۔[1]

صابری صاحب نے جو سنہ اجرا لکھا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ توسین میں ص ۳۰۶ لکھنے سے یہ بات واضح ہے کہ مندرجہ بالا بیان کا ماخذ خطبات گارساں دتاسی ہے خطبات کی پوری عبارت اوپر نقل کی جا چکی ہے۔ اس میں سنہ اجرا کا کوئی ذکر نہیں۔ چونکہ ۴ر دسمبر ۱۸۶۱ء کے خطبے میں اس اخبار کا ذکر ملتا ہے اس لئے صابری صاحب نے یہ قیاس کر لیا ہے کہ یہ ۱۸۶۱ء میں جاری ہوا۔ علاوہ ازیں انھوں نے ایڈیٹر کا نام بھی صحیح نہیں لکھا ہے۔ ایڈیٹر کا نام سید حسین علی تھا نہ کہ مولوی حسن علی خاں۔ مولوی حسن علی خاں کے متعلق صابری صاحب نے جو معلومات فراہم کی ہیں، اس کا ماخذ "مرحوم دہلی کالج" ہے۔ خود مرحوم دہلی کالج کا ماخذ مولوی کریم الدین کا تذکرہ طبقات شعرائے ہند ہے۔ طبقات کی عبارت یہ ہے:

"مولوی حسن علی خاں مدرس مدرسہ فارسی کے خلیق اور ظریف اور ہوشیار اور بہت چالاک آدمی ہے۔ انھوں نے قانون مال کا ترجمہ اور گلستاں کا اردو میں اور الف لیلہ کا اردو میں اور کرۂ ارضی کا ترجمہ بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے کیا ہے۔ وہ ترجمے چھپ گئے ہیں۔ عمر ان کی سنہ ۱۸۴۸ء میں قریب چالیس برس کے ہے۔"[2]

گارساں دتاسی نے سید حسین علی کو دلی کالج کا پروفیسر اور الف لیلہ کا مترجم بتایا ہے۔ اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ کاتب نے محولہ بالا اقتباس میں حسین علی کو غلطی سے حسن علی لکھ دیا ہو اور خاں اضافی ہو۔

محمد عتیق صدیقی نے "ہندوستانی اخبار نویسی" میں اس اخبار کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ انھوں نے کتاب کے آخر میں اردو اخباروں اور چھاپہ خانوں کی جو فہرست دی ہے اس میں مطبع حسینی کا نام تو ملتا ہے مگر اخبار حسینی کا نام نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی کتاب کی تالیف کے وقت صدیقی صاحب غالباً اس اخبار کے نام سے بھی نا آشنا تھے۔

اس دور کے بیشتر اردو اخباروں کی طرح اس اخبار کی خبروں کا ماخذ بھی انگریزی اخبار ہیں یا دوسرے اردو اخبار۔ کہیں یہ خبریں حوالے کے ساتھ نقل کی گئی ہیں اور کہیں بغیر حوالے کے۔ شروع کے چار صفحات خبروں کے لئے اور باقی چار یا آٹھ صفحات سرکاری گزٹ اور نظامیر کے لئے وقف ہیں۔ خبروں کے سلسلے میں اخبار حیدری میں جو وسعت اور تنوع ملتا ہے، وہ اس اخبار میں نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس اخبار کا مقصد خبروں سے زیادہ سرکاری گزٹ اور نظامیر کی اشاعت ہو۔ ۵ر اپریل کے شمارے میں کابل، روس، بوشہر، قندھار، فرانس، نواب ناظم بنگالہ اور ایران سے متعلق خبریں ہیں۔ ۱۷ر مئی کے شمارے میں ۱۸۵۷ء کے غدر سے متعلق حسب ذیل خبر ملتی ہیں:۔

"خبر آگرہ: اس شہر میں بہ باعث شورش پلٹن میرٹھ و دہلی تلاطم برپا ہے اور ہر شخص پر ہراس طاری دیکھئے انجام اس کا کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ لفٹنٹ گورنر بہادر نے واسطے طمانیت خاص و عام کے اشتہار جاری کئے ہیں کہ نقل اون کی بجنسہٖ کی جاتی ہے:۔

نقل اشتہار ۱۵ر مئی ۱۸۵۷ء

چونکہ یہ بات تحقیق ہوئی کہ میرٹھ کے ضلع میں اور شاہجہاں آباد اور شاہجہاں آباد کے پاس بعض باغیوں کو تہ اندیش نے یہ قصد کیا کہ سرکار انگریز کے مقابلہ میں بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا۔ اس واسطے حکم اور اشتہار دیا جاتا ہے کہ ہر ایک تعلقہ دار اور زمیندار وغیرہ مالکان زمین جو ایسی بغاوت اور سرکشی میں شامل اور شریک ہوں گا جمیع حقوق اور ملکیت زمین اپنی کو بالکل نیست نابود جانے۔ اس واسطے کہ وہ ضبط کیا جائے اور تا دوام دوسرے دیانت دار تعلقہ دار زمینداروں وغیرہ اس نواح کے طرف منتقل کی جائے گی جو سرکار کی اطاعت اپنے اعمال سے ظاہر کریں اور اپنی جد و جہد سے واسطے آسائش ملک کے ثابت کریں کہ سرکار سے ایسے انعام کے مستحق ہیں۔ سرکار انگریز ذی اقتدار بوضع اشتہار یہ بات ظاہر کرے کہ اپنے دوستوں کی جزا اور دشمنوں کی سزا قرار واقعی دیتے چلے آتے ہیں۔

جناب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی کے حکم سے مشتہر کیا گیا۔

سی۔ بی۔ تھارنہل

قائم مقام سکریٹری گورنمنٹ مغربی"

اس کے بعد ایک اور سرکاری اشتہار ہے جو طوالت کے خوف سے نقل نہیں کیا جاتا۔ ۱۷ر مئی کے شمارے میں غدر سے متعلق کوئی خبر نہیں۔ ۲۴ر مئی کے بعد کا کوئی شمارہ فائل میں نہیں ہے۔ اس لئے قیاس یہ کہتا ہے کہ غالباً یہ اخبار ہنگامۂ غدر کی نذر ہو گیا۔

اس اخبار کے چند شماروں میں غزلیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ چنانچہ ۱۹ر اپریل کے شمارے میں منشی صفدر حسین خاں سررشتہ دار فوجداری ضلع اعظم گڑھ اور مرزا آغا حسین رئیس شہر اکبرآباد کی غزلیں ہیں۔ ۳ر مئی کے پرچے میں مولوی مفتی محمد یحییٰ کی فارسی غزل اور منشی صفدر حسین اور مرزا آغا حسین کی اردو غزلیں ہیں۔ ۲۴ر مئی کے شمارے میں مرزا سخاوت علی کی غزل چھپی ہے۔ ان تمام غزلوں کے مطلعے بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

اس میں پھرتا ہے جو نقشہ وہ رخ روشن کا
آنکھیں صفدر کی ہیں یا گھر ہے بت پر فن کا
(صفدر حسین)

نہ گریباں کا الجھاؤ نہ کچھ دامن کا
جوش وحشت میں کسے ہوش ہے پیراہن کا
(آغا حسین)

(باقی صفحہ ۹ پر)

---

[1] تاریخ صحافت اردو جلد دوم، ص ۱۸۱

[2] طبقات شعرائے ہند، ص ۴۰۶

مراسلات

اردو ذریعہ تعلیم

۲۸ جولائی ۱۹۶۹ء کے قومی آواز میں ہماری زبان (علی گڑھ) کا اداریہ بعنوان "حکومت ہند کا ترقی اردو بورڈ" نقل ہوا ہے، اس میں ایک ایسی بات لکھدی گئی ہے جس سے ایوان حکومت اور عوام دونوں میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے میں اس متوقع غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ اداریے میں لکھا گیا ہے: "اگرچہ اس وقت شاید ہی کسی یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو ہو، صرف بعض جگہ اردو میں جوابات دینے کی سہولت ہے۔ ..." معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس کے قواعد و ضوابط کے مطابق بی اے، بی ایڈ، بی ایس سی اور بی اے آنرز تک ذریعہ تعلیم اردو ہے اور مجلس تعلیمی کی اجازت سے انگریزی اور ہندی میں جوابات دینے کی سہولت ہے۔ آزادی کے بعد جامعہ کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ رفتہ رفتہ باہر سے آنے والے ایسے طلبہ کی تعداد کم ہونے لگی جنھوں نے اردو میڈیم سے ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری، انٹرمیڈیٹ یا بی اے پاس کیا ہو، یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش میں ایسے ثانوی اسکولوں اور انٹر کالجوں میں بھی جنھیں اردو دوست حلقے چلا رہے تھے اردو زبان ذریعہ تعلیم نہیں رہی، خود دلی میں صرف دو تین اسکول ایسے رہ گئے جہاں آرٹس کے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں اور سائنس کے مضامین انگریزی میں ایسی صورت میں مختلف دشواریوں کے باوجود جامعہ نے ذریعہ تعلیم اردو رکھا۔ اس وقت اس لحاظ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ ملک کے وہ واحد ادارہ ہے جہاں اردو زبان ذریعہ تعلیم ہے اور اندرونی طور پر اس کی دفتری زبان اردو ہے۔ اب سترہ برس بعد اترپردیش میں حکومت کا ایک سرکلر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اردو والے تقریباً سوڈیڑھ سو ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کو اردو میڈیم کے اسکول اور کالج بنا سکتے ہیں، اترپردیش والے یہ کام انجام دیں تو جامعہ کو اردو میڈیم کے طلبہ کافی تعداد میں مل سکتے ہیں اور جامعہ مکمل طور پر ایسی یونیورسٹی بن جائے گی جہاں ایم۔ اے اور ایم ایس سی تک اردو میں تعلیم ہو سکے گی۔

● ضیاء الحسن فاروقی

تصویر غم ۔۔۔!

جناب موسیٰ مجروح صاحب اورنگ آبادی کا ایک مضمون "تصویر غم" ھدیٰ مئی ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا جو دو تین فقروں اور چند تبادلوں کے اضافہ کے ساتھ بعینہ وہی مضمون تھا جو ہماری زبان اگست ۱۹۶۷ء میں "آہ خانہ" اور علی گڑھ اردو ادب ۱۹۶۸ء میں تاج محل کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ مضمون میں ممتاز محل کے عارضی مدفن کا بیان تھا۔

مدیر ھدیٰ کے نام مذکورہ مضامین بھیجے گئے ۲۸ اگست ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں عبید اللہ کوثی نے ایک مراسلہ میں مذکورہ بالا مضامین پر تبصرہ کیا جس کے جواب میں جناب موسیٰ مجروح صاحب نے ۱۵ ستمبر کے ہماری زبان میں لکھا کہ کچھ سطور کی مماثلت کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے۔ ہم نے انیشوری پرشاد کی کتابیں دیکھیں۔ ان میں وہ تفصیل اور تصاویر نہیں جو آج کل مئی ۱۹۶۹ء کے مطبوعہ مضمون ۔ "ممتاز محل کا عارضی مدفن" میں ملتی ہیں۔ ھدیٰ میں تاج محل کی دو تین غیر متعلق تصویریں تھیں۔

ناظرین کرام اور جناب موسیٰ مجروح صاحب سے گزارش ہے کہ وہ ھدیٰ مئی ۱۹۶۸ء اور آج کل مئی ۱۹۶۹ء کے مضامین کو پڑھ کر مماثلت کا اندازہ کریں۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

جبلپور ● ابورضا سعید انصاری

ایک گزارش

شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں نیاز فتح پوری پر پی ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس سلسلہ میں "زمیندار" لاہور ۱۹۱۳ء جس میں مسجد کانپور کے واقعات کی تفصیلات ہیں، درکار ہے "توحید" میرٹھ "رعیت" دلی کے پرانے فائلوں کی بھی ضرورت ہے جو نیاز صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ یہ پرچے کسی بھی لائبریری میں نہیں مل سکے اگر کسی اہل ذوق کے پاس یہ رسالے موجود ہوں تو براہ کرم اس پتے پر مجھے لکھیں۔ رسالے دیکھنے کے بعد بحفاظت واپس کر دئے جائیں گے اگر کوئی صاحب ان رسائل کو فروخت کرنا چاہیں تو وہ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کو لکھیں۔

شوکت منزل دودھ پور ● امیر عارفی
علی گڑھ

غالب نوازوں سے اپیل

غالب نوازوں اور ہماری زبان کے پڑھنے والے حضرات سے مودبانہ گزارش ہے کہ جن جن اصحاب نے دیوان غالب بخط غالب "نسخہ امروہہ" کے بارے میں جو مضامین جن جن رسالوں میں طبع کرائے ہیں ان رسالوں کی مجھے ضرورت ہے یا ان مضامین کی نقل مجھے روانہ کر دیں رسالوں کے مکمل پتے سے بھی آگاہ کریں۔ میں ان تمام گذشتہ مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں طبع کرانا چاہتا ہوں تاکہ یہ علمی سرمایہ محفوظ ہو جائے۔

● توفیق احمد قادری چشتی، مالک نیشنل بک ڈپو امروہہ

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شب گشت (مجموعہ کلام)
مصنف:۔ عتیق حنفی
ناشر:۔ شب خون کتاب گھر، ۳۱۳، رانی منڈی، الہ آباد
قیمت:۔ ۵ روپے، صفحات: ۱۰۹

نغمۂ شب (ایک طویل نظم)
مصنف:۔ اختر بستوی
ناشر:۔ شب خون کتاب گھر، الہ آباد
قیمت:۔ دو روپے، صفحات ۷۲

انجمن کی سرگرمیاں

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو

پٹنہ:- بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر محمد یونس ایم. بی. بی. ایس بھاگلپور بتاریخ ۱۰ راگست دفتر انجمن میں منعقد ہوا جس میں غلام سرور ایڈیٹر سنگم پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر مظفر اقبال بھاگلپور، شاہ مشتاق احمد سابق ایم. ایل. اے، جناب تقی رحیم، جناب معصوم شرقی جناب اظہار عالم، جناب ضیاء الدین اور جناب صدیقی جنرل سکریٹری وغیرہ نے شرکت کی سابقہ کارروائیوں کی تصدیق کے بعد جنرل سکریٹری نے اردو تحریک کے متعلق موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی اور ریاستی انتخاب میں غیر معمولی تاخیر کے اسباب کی وضاحت کی جسب ذیل تجاویز متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا سالانہ انتخابی اجلاس نومبر کے دوسرے ہفتہ تک یقینی طور پر منعقد کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں جنرل سکریٹری کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ مقام و جگہ و دیگر تفصیلات کے لئے ریاستی کانفرنس کے انعقاد کی دعوت دینے والی ضلعی شاخوں سے وہ جلد خط و کتابت کریں۔ ممبران مجلس عاملہ نے ریاستی کانفرنس کے لئے بہار شریف کو زیادہ موزوں جگہ قرار دیا۔

طے پایا کہ ضلعی شاخوں کو ہدایت کی جائے کہ جلد از جلد اپنی شاخوں کو نئے ضابطہ کے مطابق بنا لیں تاکہ ان کے نمائندے ریاستی عہدیداروں کے انتخاب میں حصہ لے سکیں۔

طے پایا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کی راہ میں پیدا شدہ مشکلات کو دور کرنے اور نئے اردو تعلیمی اداروں کے قیام کے سلسلے میں ریاستی سطح پر اعداد و شمار اکٹھا کرنے کا جنرل سکریٹری کو اختیار دیا جائے تاکہ اردو کے فروغ و ترقی کی راہ میں پیدا شدہ مشکلات کو دور کرنے کی جد و جہد کو کامیاب بنایا جائے۔

اس سلسلے میں یہ بھی طے پایا کہ تمام ضلعی شاخوں کو ہدایت کی جائے کہ ریاستی انجمن کے تعمیری پروگرام کو آگے بڑھائیں اور پرائمری، سکنڈری اور یونیورسٹی سطح کی تعلیم گاہوں میں اردو تعلیم کی بحالی اردو مکاتب، اردو مڈل اسکول، ہائی اسکول اور گرلس اسکولوں کے قیام میں اپنے بہتر ذرائع و وسائل کو استعمال کریں اور کامیابی کے لئے محبان اردو کا تعاون حاصل کریں۔ مجلس عاملہ نے اپنی تجویز میں یونیورسٹی سطح پر اردو تعلیم کے فروغ و ترقی میں موجودہ اہم مشکلات اور رکاوٹوں پر بھی غور کیا اس مرحلے پر بہار کے ٹریننگ کالجوں میں اردو ذریعہ تعلیم (URDU METHOD) کے حلقوں کی بحالی میں اب تک جو بے اعتنائی کی گئی ہے اسے ذمہ داروں کی تنگ نظری پر مبنی خلاف انصاف پالیسی قرار دیا یونیورسٹی تعلیمی توسیعی سروس کے ذمہ داروں کے رویہ کو بھی مذمت کے لائق قرار دیا۔ اس سلسلے میں ٹریننگ کالج اور یونیورسٹی کے ذمہ داروں کی توجہ دلانے اور ان سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے جنرل سکریٹری کو اختیار دیا گیا تاکہ انجمن کا ایک وفد ذمہ داروں سے جلد مل سکے۔ آخری تجویز میں مجلس عاملہ اور مجلس منتظمہ کے ارکان سے درخواست کی گئی کہ انجمن کی تنظیم اور تحریک کو موثر بنانے کے لئے انجمن کے ساتھ مالی تعاون کریں۔ اور گذشتہ تجاویز کی روشنی میں مالی اعانت کی بقایا رقم جلد ادا کر دیں۔

———۲———

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے ایک سوالنامے کے ذریعہ اردو کے سلسلے میں اعداد و شمار یکجا کرنے کی مہم شروع کی ہے تاکہ اسی کی روشنی میں باضابطہ طور پر کوئی موثر قدم اٹھایا جا سکے۔ سوالنامے کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

—×—

"محبان اردو! حالات کا تقاضا ہے کہ مصلحت پسندی اور سود و زیاں کے نام پر گمراہ کرنے والوں کی گرفت سے آزاد ہو کر پوری طاقت کے ساتھ اپنے وسائل اپنے ذرائع کو تعمیری محاذ پر حوصلہ مندی کے ساتھ کام میں لائیں اور منصوبہ بند طور پر کام شروع کر دیں۔ لیکن اس مقصد کے حصول میں آگے بڑھنے سے پہلے ہمارے سامنے اعداد و شمار ہونا چاہئے۔ تاکہ ہم کوئی موثر قدم اٹھا سکیں اس مرحلے پر محبان اردو اور اہل فکر حضرات کی مدد اور تعاون درکار ہے اور امید ہے کہ ذیل کے سوالنامے کا جواب جلد ارسال فرما کر اردو دوست بھی اپنے فرائض کی ادائیگی سے سبکدوش ہونے میں اپنے گہرے تعاون کا اظہار کریں گے۔

سوالنامہ

(۱) گاؤں یا محلہ، وارڈ یا شہر کا نام۔

(۲) تھانہ ڈاکخانہ، ریلوے اسٹیشن اور ضلع ؟

(۳) کل آبادی (تقریباً) اردو آبادی (اندازاً)

(۵) الف۔ پرائمری اسکول پہلے سے موجود ہے ؟

ب۔ سکنڈری یا ہائر سکنڈری یا کالج موجود ہے ؟

ج۔ ہے تو وہاں اردو کی تعلیم ہوتی ہے ؟

د۔ کالج میں صرف اردو کمپوزیشن کی تعلیم ہوتی ہے ؟ یا پرنسپل اردو اور آنرس کی تعلیم بھی ہوتی ہے ؟ واحد لفظی شعبے میں یا یونیورسٹی ضوابط کے مطابق ہیں۔ مذکورہ مرحلوں کے لئے الحاق لیا گیا ہے یا نہیں ؟

(۶) اردو طلبہ کی تعداد کیا ہے (وضاحت درکار ہے)

(۷) اردو پرائمری اسکول یا اردو مڈل اسکول یا اردو ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری اسکول ہے یا نہیں ؟

(۸) نزدیکی گاؤں یا پاس والے محلے یا شہر میں پرائمری اسکول یا مڈل یا ہائی یا ہائر سکنڈری اسکول کھل سکتا ہے ؟

(۹) کتنے اردو کے داخلے ہوں گے ؟

(۱۰) الف۔ کوئی صاحب زمین کا عطیہ دیں گے ؟

ب۔ فنڈ فراہم کریں گے ؟

ج۔ نئے اسکول کے لئے کوئی کمرہ یا اسکول یا مکان تیار کریں گے ؟

(۱۱) تعلیم دینے کے لئے معلم مل جائیں گے یا نہیں ؟

(۱۲) بچیوں کی تعلیم کی سہولت ہے یا نہیں۔ سوالات مندرجہ بالا کی روشنی میں جواب دیں۔

انجمن ترقی اردو شاخ پٹیالہ کا ادبی جلسہ

پٹیالہ۔ کچھ دنوں پہلے انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ پٹیالہ کے زیر اہتمام انجمن ہند کے ممتاز کارکن اور پنجاب کے کہنہ مشق شاعر جناب برج لعل کو بلی نازاں کے دعوت نامہ اور صدارت میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں اردو ہندی اور پنجابی کے متعدد شعراء نے شرکت فرمائی شرکاء میں جناب نوبہار صابر، جناب جسونت سنگھ ذہتا، جناب آزاد انبالوی، جناب ساغر شفائی، جناب جوہر بھارتی، جناب بسمل پٹیالوی، جناب بینش، جناب پریتم سنگھ نصرت، جناب ماجندر رفعت، جناب مسرور لکھنوی، جناب پریم پال، جناب پریتم سنگھ پنچھی، جناب درج اور پروفیسر جوگندر سنگھ بھی شامل تھے۔

اسٹیج سکریٹری کے فرائض جناب ساغر شفائی نے انجام دئے۔

● جوہر بھارتی سکریٹری

یو۔پی اسمبلی میں اردو کا مسئلہ

لکھنؤ۔ اتر پردیش اسمبلی میں بجٹ پر مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے جناب مصطفےٰ کامل قدوائی نے تعلیم کے مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اردو زبان کے بارے میں جناب مصطفےٰ کامل قدوائی نے کہا کہ میں ۱۰ سال تک ملک کے باہر رہا ہوں۔ ایسے ممالک میں بھی مجھے رہنے کا اتفاق ہوا جو کہ ہندوستان کی کوششوں سے آزاد ہوئے مگر کسی بھی ملک میں کسی زبان کو ختم کرکے دوسری زبان کو سرکاری حیثیت نہیں دی گئی۔ جیسا کہ یہاں ہندی کو سرکاری زبان بنانے کے لئے اردو کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ ہندی سرکاری زبان کی حیثیت سے ہمارے لئے قابل قبول ہے۔ مگر اردو کو بھی اس کا جائز حق ملنا چاہئے۔ یہ اچھا ہے کہ بجٹ میں اس کے لئے دس لاکھ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ مگر یہ ساری رقم محض کمیٹیوں اور ان کے ممبروں کی میٹنگوں میں صرف نہ ہونی چاہئے۔　　● سیاست

—— ۲ ——

کانگریسی ممبر حامی جمیل عباسی نے مباحثے میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی زبان اگر کوئی ایک ہو سکتی ہے تو وہ صرف ہندی ہو سکتی ہے لیکن ہندی کی محبوبیت کو شدید نقصان ہندی پریمیوں سے پہنچ رہا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ہندی میں سنسکرت ضرورت سے زیادہ ٹھونسی جا رہی ہے اور زبان مشکل سے مشکل تر بنائی جا رہی ہے۔ دوسرے ہندی کو محبوب بنانے اور انگریزی کو ہٹانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہندی کے ساتھ ہندوستان کی دیگر زبانوں سے بھی محبت کرنا سیکھیں۔ خصوصاً اردو سے جو ہمارے صوبہ میں خوب بولی اور لکھی جاتی ہے۔

انھوں نے کہا۔ یوں تو حکومت یو۔پی نے بجٹ میں دس لاکھ روپے اردو کی ترقی کے لئے رکھا ہے۔ لیکن آپ سوچیں کہ جب اردو ٹیچرس ٹرینڈ (TRAINED) نہیں کئے جائیں گے اور اردو کی نصابی کتابیں چھاپی نہیں جائیں گی تو اردو اسکولوں میں کیسے پڑھائی جا سکتی ہے۔ قاضی صاحب نے مزید کہا "کوٹھاری کمیشن کے صفحہ ۱۹۰ پیراگراف ۸-۴۸ میں درج ہے ہم اس تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ سنسکرت یا کسی دوسری کلاسیکل زبان کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کیا جاوے۔ ہماری رائے میں اس فارمولے کو جدید ہندوستانی زبانوں تک محدود رکھا جاوے:

حکومت یو۔پی نے سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کر لیا۔ اور ہندی کے لازمی مضمون کے پرچے میں بھی سنسکرت کو شامل کر رکھا ہے نتیجہ یہ ہے کہ اردو تعلیم کی راہ ثانوی سطح پر یعنی جونیر ہائی اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں بند ہو گئی ہے:

انھوں نے کہا "ہم کو جو ہندی اچھی طرح نہیں جانتے انھیں اسمبلی میں اپنے حلقہ کی پوری نمائندگی کرنے پر بھی بڑی زحمت ہے۔ کتابوں کے بوجھ سے ہیں جو صرف زینت بنے رہتے ہیں۔ انگریزی میں کاغذات ہم نہیں چاہتے لیکن قیامت نہیں آجائے گی اگر اردو میں کاغذات و کتابیں ہمارے لئے مہیا کر دی جاویں اس طرح اگر اردو میں حلف ہو جاتی تو آسمان نہ پھٹ پڑتا۔ ان باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

انھوں نے کہا حالات بدلے ہیں ورنہ اس ایوان میں اگر ۲۰ سال پہلے میں اس طرح کی تقریر اردو کے لئے کرتا تو مجھے پاکستانی کہا جاتا آج تو وزیر تعلیم نے اپنی تقریر میں چھ سات بار اردو کا نام لیا ہے اور دس لاکھ روپیہ اردو کی ترقی و توسیع کے لئے بجٹ میں منظور کیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ قدم اور آگے بڑھے گا۔

● قومی آواز

ایک ضروری درخواست

ہماری زبان کے قلمی معاونین اور مراسلہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مسودے صاف اور واضح انداز میں کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوئے ہوں خریدار حضرات خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

اخبار و افکار

"گرمئ اندیشہ" کی رسم اجرا

دہلی رائٹرس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام مورخہ ۱۰ راگست کو پریس کلب، نئی دہلی میں صغیر احمد صوفی کے دوسرے مجموعہ کلام "گرمئ اندیشہ" کی رسم اجرا منعقد ہوئی۔

جلسہ کی صدارت پنڈت آنند نرائن ملا نے فرمائی اور کتاب کی رسم اجرا جناب یونس سلیم (نائب وزیر قانون) نے ادا کی۔

"گرمئ اندیشہ" کا افتتاح کرتے ہوئے یونس سلیم صاحب نے صوفی کے کلام کی ان خصوصیات کا ذکر کیا جو روایت سے انحراف کے باوجود ادبی تاریخ کے شعور اور فنی قدروں کے احساس کے باعث ان کے یہاں موجود ہیں۔

مشہور افسانہ نگار جناب کوثر چاندپوری نے اپنی تقریر میں صوفی کی نظموں اور غزلوں میں خارجی حقائق اور داخلی احساس کے اشتراک سے اظہار کی ایک مستحکم اور جاندار روش کی نشان دہی کی۔

منفرد افسانہ نگار اور ادیب جناب پریم ناتھ در نے کہا کہ عہد جدید میں ادبی قدریں اس فلسفہ اظہار کی حامل ہیں جن کی تعمیر میں حلقہ ارباب ذوق نے حصہ لیا ہے۔ انھوں نے صوفی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے، قدیم و جدید ادبی تصورات کے سنگم کو صوفی کی انفرادیت قرار دیا۔

صدر جلسہ آنند نرائن ملا نے صوفی کو داخلی احساس اور لاشعور کا ترجمان قرار دیا اور ان کی نظموں اور غزلوں میں فنی اور ادبی قدروں کے احترام کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنے کے رویے کو ایک صحت مند علامت بتایا۔

جلسہ کے اختتام سے قبل مشہور موسیقار حفیظ احمد خاں، مشتری بیگم اور نگار نے صوفی کا کلام پیش کیا۔

اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ بہت عرصے کے بعد دہلی کے تقریباً تمام اہم ادبا اور شعرا یکجا ہو گئے تھے۔ صوفی کو دہلی کے تمام حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس لیے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کا ایسا صاف ستھرا اور معیاری جلسہ بہت عرصہ کے بعد منعقد ہوا۔ شہر کے بہت سے معززین نے بھی جلسہ میں شرکت کی اور صغیر احمد صوفی کو مبارکباد پیش کی۔ ● نامہ نگار

"شب گشت" : ایک شام : ایک گفتگو

۱۴ راگست، شام ساڑھے پانچ بجے جناب حسن نعیم کی رہائش گاہ A-8 ایکسٹرنل افیئرس ہوسٹل، کرزن روڈ نئی دہلی پر الہ آباد، علی گڑھ اور دہلی کے متعدد ادیبوں اور شاعروں نے عتیق حنفی کے مجموعہ کلام "شب گشت" پر شاعر کو مبارکباد پیش کی اور اس مجموعہ کلام پر تبادلہ خیالات کیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر شعیب الرحمن نے فرمائی۔ علی گڑھ سے شعیب صاحب کے علاوہ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر شمیم حنفی، الہ آباد سے ڈاکٹر جعفر رضا اور ہندوستانی لسانیات کے ایک جرمن ریسرچ اسکالر طاہرہ تغیان اور دہلی سے پریم ناتھ در، بلراج کومل، مخمور سعیدی، رفعت سروش، سریندر پرکاش، کرشن موہن، بانی، ایم۔ اے۔ زبیر رضوی، محمود ہاشمی، راج نرائن راز، شہباز حسین، صغیر احمد صوفی، دویندر اسر، کیلاش ماہر، شمس الحق عثمانی، حسن نعیم، کے کے تیز، یوگ راج، بدیع الزماں، شہاب جعفری، انور عظیم، ہرنام سنگھ سوز، کیول دھیر وغیرہ نے شرکت فرمائی۔

"شب گشت" پر جناب بلراج کومل کے تبصرے سے گفتگو کا آغاز ہوا۔ کومل صاحب نے عتیق حنفی کے چند مخصوص شعری رویوں کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے کہا کہ عتیق کی شاعری میں ایک خاص قسم کی ماورائیت TRANSCENDENCE پائی جاتی ہے جو ان کے احساس و اظہار کو ان کی ذات سے گذار کر کائنات تک لے جاتی ہے۔ کومل صاحب نے عتیق حنفی کی اس خصوصیت کا ذکر بھی کیا جو ان کی لفظیات کو وسیع تر معنوی اور حسی فضا عطا کرتی ہے۔ کومل کے تبصرے پر انور عظیم، ڈاکٹر وحید اختر اور کرشن موہن وغیرہ نے بحث میں حصہ لیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شمیم حنفی نے عتیق حنفی کی شاعری پر ایک مفصل مقالہ پڑھا جس میں عتیق حنفی کے جغرافیائی، سماجی اور ادبی پس منظر میں ان کی شاعری کے اساسی پہلوؤں سے بحث کی گئی تھی۔ شمیم حنفی نے عتیق کی شاعری میں دیہات، جنگل اور شہر کے علامتی مفاہیم، کھردرے اور نوکیلے الفاظ اور درشت و بے ساختہ اظہار کی مختلف سطحوں کا تجزیہ کیا اور عصری حقیقتوں کے پس منظر میں عتیق کی شاعری میں فطرت کے علائم کی معنویت پر اظہار خیال کیا۔

مخمور سعیدی نے "شب گشت" کی غزلوں پر ایک مختصر مضمون پڑھا جس میں انھوں نے عتیق کی غزلوں میں دردمندی کی جگہ جوش مندی کی نشاندہی کی۔

صدر نشست ڈاکٹر شعیب الرحمن نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ وہ عتیق حنفی کی شاعری گذشتہ بارہ برس پڑھ رہے ہیں اور عتیق حنفی سے اس وقت سے متعارف ہیں جب وہ کوئی آٹھ برس پہلے علی گڑھ تشریف لائے تھے اور پروفیسر آل احمد سرور کی رہائش گاہ پر منعقد ایک ادبی نشست میں شریک ہوئے تھے۔ شعیب صاحب نے کہا کہ عتیق کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ عتیق کی شاعری میں SOCIAL، SOCIAL CONSCIOUSNESS، COMMITMENT اور INVOLVEMENT ان حضرات کی شاعری سے بھی زیادہ اور گہرا ہے جو ان خصوصیات کو نظریہ بنائے ہوئے ہیں۔ شعیب صاحب نے مزید کہا کہ عتیق کے یہاں زبان کا استعمال نہ صرف برجستہ ہے بلکہ پرانے شعری تعبیرات سے آزاد بھی ہے۔ پہلے جب شاعر "غیر شاعرانہ" الفاظ کا استعمال کرتا تھا تو گراں گزرتا تھا لیکن نئے شاعر بالخصوص عتیق حنفی نثر کے کھردرے الفاظ کو بھی ایک ایسے حسی زاویے سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی خوبیاں مجروح نہیں ہوتیں۔ شعیب صاحب نے کہا کہ "شب گشت" نئی شاعری کا ایک اہم اور تازہ مجموعہ کلام ہے جس پر عتیق حنفی کو مبارکباد دینی چاہیے۔ ● نامہ نگار

دہلی یونیورسٹی اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کا جلسہ

دہلی یونیورسٹی اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر قمر رئیس ریڈر شعبۂ اردو نے "غالب اور جدید کلاسیکی غزل" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے فرمائی۔

جلسے کا آغاز ڈاکٹر محمد حسن کی تقریر سے ہوا جس میں انھوں نے انجمن کا تعارف کرایا اور معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مقالے میں ان اثرات کا تاریخی تجزیہ کیا جو غالب کی غزل سے بعد کے غزل گو شعرا پر مرتب ہوئے۔ انھوں نے ان اثرات کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا ایک طرف وہ شعرا ہیں جنھوں نے غالب کے فکری آہنگ سے اثر قبول کیا ہے اور ان کی صحت مند تشکیک ان کی عقلیت اور بصیرت ان کے تصور حیات سے اپنے چراغ روشن کئے اور دوسری طرف وہ غزل گو شعرا ہیں جنھوں نے غالب کے طرز و اسلوب سے اثر قبول کیا، اور مرکب ترکیبوں اور تہ دار اسلوب اور ان کے انداز بیان کے شکوہ و رنگینی سے متاثر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے مرزا رسوا، عزیز لکھنوی، اصغر اور وحشت کو موخرالذکر صف میں شمار کیا اور مثالوں سے ان کی غزلوں پر غالب کے اثرات واضح کئے انھوں نے کہا کہ اسلوب غالب کی پیروی کے اعتبار سے فانی ان میں سب سے زیادہ کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ اول الذکر صف میں اقبال کا ذکر انھوں نے خصوصیت کے ساتھ کیا انھوں نے یہ بھی کہا کہ یگانہ غالب شکن ہوتے ہوئے بھی غالب کے نظام اقدار اور ان کے طنزیہ رویے سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ مقالے کے بعد بحث ہوئی جس میں صدیق الرحمن قدوائی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی شہاب جعفری، ڈاکٹر عبد الحق اور دوسرے حضرات نے حصہ لیا بحث کے بعد پروفیسر احتشام حسین نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ اور نیا تصور بخشا ہے۔

غالب اپنے دور کے نمائندے تھے لیکن چونکہ انھوں نے اپنی بصیرت سے ان عوامل اور عناصر کو دیکھ لیا تھا جو اس زمانہ کی تقدیر بنا اور بگاڑ رہے تھے اس لئے، ان کی بصیرت میں ایک ایسا عنصر شامل ہو گیا جو آج بھی ان کی طرف دلوں کو کھینچتا ہے غالب کے اثرات کی نشاندہی اس صورت میں زیادہ آسان ہے کہ ہر وہ شاعر جو اپنے اور عصری حقیقتوں کے شعور اور ان کے باہمی ربط اور تضادم سے آگاہی رکھتا ہے اور ان سے اپنی شاعری کے تار و پود بنتا ہے وہ گویا کسی نہ کسی حیثیت سے غالب کی روایت کو آگے بڑھاتا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر محمد حسن نے جناب صدر، مقالہ نگار اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

● سید ظہیر احسن

ادارہ قومی ادب آندھرا پردیش کا جشن آزادی

ادارہ قومی ادب آندھرا پردیش کے زیر اہتمام جشن آزادی منایا گیا جناب سید رحمت علی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شاعروں اور ادیبوں کو قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی ترقی کے لئے صرف قوانین بنانے سے قوم کی تقدیر نہیں بن سکتی۔ بلکہ متحدہ جد و جہد سے معاشی مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے اور اسی طرح ملک کی آزادی کا تحفظ ممکن ہے۔

جناب مرزا سرفراز علی نے آزادی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہماری زندگی کا ہر لمحہ وطن کی ترقی کے لئے وقف ہونا چاہیے۔ اور جس آزادی کے لئے بزرگوں نے جان کی بازی لگائی تھی اس کی حفاظت کے لئے ہم سب کو متحد ہو کر قدم بڑھانا چاہیے۔ ادبی اجلاس کے بعد مشہور و ممتاز شاعر جناب خورشید احمد جامی کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب سعید شہیدی، خیرات ندیم، طالب رزاقی، روحی قادری، ڈاکٹر غیاث صدیقی، سرفراز علی سرفراز، ڈاکٹر ناظم مرزائی، علی افسر، حسام الدین سلیم، اعظم علی احمد، رضا دصفی، اثر غوری، حبیب محوی، ضیا فاروقی، مظفر صاحب بے ہوش، جوہر ہاشمی، شفیع اقبال، نظری بدایونی، رام ناتھ صبا، طیبہ بہار، ضیا ساحری، بادل عباسی، رشید شہیدی، مقصود جاوید اور مہمان خصوصی پرنس لئیق علی خاں ثاقب کے علاوہ دیگر شعرا نے کلام سنایا۔ جناب نظیر علی عدیل معتمد مشاعرہ کے شکریہ پیش کی کلدوائی کا اختتام عمل میں آیا۔

● حسام الدین سلیم

شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں جشن غالب

گورکھپور یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں "جشن غالب" کے پروگرام کے تحت ڈاکٹر محمود الٰہی، صدر شعبۂ اردو کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں جدید نسل کے مشہور نقاد اور شاعر جناب شمس الرحمن فاروقی نے "غالب اور جدید ذہن" کے عنوان سے تقریر کی۔

فاروقی صاحب نے غالب کی شعریات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو میں سب سے پہلے غالب نے لفظ اور معنی کی دوئی کو ختم کیا اور اپنے اشعار کے ذریعہ بیدل کے اس شعر کی تفسیر پیش کی ؂

درین گلشن کہ رنگش ریختند از گفتگو بیدل
شنیدن ہاست دیدن ہا و دیدن ہا شنیدن ہا

یہی وجہ ہے کہ آج کا ادیب اور شاعر اردو شعر و ادب میں سب سے زیادہ اپنے آپ کو غالب سے قریب پاتا ہے، کیونکہ اس کے شعری مابعد الطبیعات کی بنیاد بھی لفظ و معنی کی وحدانیت پر قائم ہے۔

آخر میں طلبہ کے چند سوالات کے جواب میں موصوف نے اردو میں جدیدیت کی تحریک پر بھی روشنی ڈالی۔

● اطہر فاروقی

ادبی سنگم جامعہ نگر کے زیر اہتمام اردو سمپوزیم

نئی دہلی کچھ روز پہلے ادبی سنگم جامعہ نگر کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب ظفر پیامی نے فرمائی۔ سب سے پہلے "اردو اور ہندی صحافت کے نئے رجحانات" کے موضوع پر ایک سمپوزیم ہوا جس میں ظفر پیامی صاحب کے علاوہ خان غازی صاحب کابلی (سابق ایڈیٹر پرتاپ لاہور) وحید الدین خان صاحب (ایڈیٹر الجمعیۃ دہلی)، رتن پرکاش شیل صاحب (ایڈیٹر اخبار سنسار ساگر میرٹھ)، انور علی خاں سوز صاحب اور عبد اللطیف اعظمی صاحب نے حصہ لیا۔

ظفر پیامی صاحب نے فرمایا کہ اردو کی بقا کا مسئلہ اردو صحافت سے بالکل قریب ہے۔ نوجوان نسل اگر اردو سے واقف نہ ہوگی تو اردو تحریکوں کو کون پڑھے گا۔ آخر میں جناب کیلاش ماہر صاحب، کرشن موہن صاحب اور جناب خان غازی کابلی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

● سعید نظر برنی

تبصرہ

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

کتاب :- ذکر و فکر
مصنف :- برجم ناتھ دت قاصر
ناشر :- مصنف، ۱۰ کرشنا مارکیٹ امرتسر
قیمت :- تین روپے ۵۰ پیسے

جناب برجم ناتھ دت قاصر بڑی خوبیوں کے بزرگ ہیں۔ عمر اس وقت اسّی سال کے قریب ہے۔ پنجاب کے ایک گاؤں ویروکاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قدیم مشرقی انداز میں ہوئی اس لئے فارسی شاعری سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ انگریزی تعلیم دسویں درجے تک حاصل کی اس کے بعد بقول خود پولیس میں بھرتی ہو گئے مگر ان کا دل اس پیشے میں نہ لگا اور ملازمت ترک کر دی۔

"والد کو میرا باپ ہونے کے بجائے تھانیدار کا باپ ہونا زیادہ پسند تھا۔ ان کی مراد پوری نہ ہوئی۔ خفا ہو کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ ماں تھی نہیں کہ راستہ روکتی۔ ناچار لڑکے کے فاقے سہتا پاپیادہ چل دیا۔ کئی دنوں کی خاک چھاننے کے بعد نہایت قلیل تنخواہ پر شالے کے ایک بنئے کے یہاں نوکر ہو گیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ ۱۹۱۳ء میں مالکوں نے ترقی دے کر امرتسر بھیج دیا جب سے یہیں ہوں۔"

قاصر صاحب اپنے عقائد کے اعتبار سے صوفی صافی ہیں فرماتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ خدا رب العالمین ہے۔ صرف میرا آپ کا نہیں ساری دنیا کا خدا اور کائنات کا سہارا ہے کسی نام سے پکارو وہ خدا ہی رہے گا۔ . . . . . . مذاہب کا ایک ہی سے یعنی جستجو کے حق ماحول اور راستے چاہے الگ ہوں منزل مقصود ایک ہی ہے۔"

"ذکر و فکر" قاصر صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں متعدد مضامین خود نوشت سوانح کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً "میں خود" "میرا نام" "میرا گاؤں" "میراث" اور "میری اماں" وغیرہ کچھ مضامین میں انشائے لطیف اور شوخ خیزی کا انداز ہے مثلاً "میرا قلم" "میرے آنسو" "میرا خط . . . کے نام" وغیرہ اس سے قبل قاصر صاحب نے اپنے خطوط کا ایک مجموعہ "ڈال ڈال پات پات" کے نام سے شائع کرایا تھا۔ اس کتاب میں موصوف نے خطوط کے پیرائے میں اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ تصورات کا اظہار کیا تھا اور نیاز فتح پوری نے اسے پند نامہ فریدالدین عطار سے تعبیر کیا تھا۔

شاعری میں قاصر صاحب کو حکیم الشعرا حکیم فریدالدین طغرائی سے تلمذ حاصل ہے اپنے استاد سے انھیں اس قدر عقیدت ہے کہ وہ انھیں اقبال سے بھی بڑا شاعر سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ان کے استاد کی قدر و منزلت ان کے رتبے کے مطابق نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں ان کے خیالات بہت ہی دلچسپ ہیں فرماتے ہیں:-

"استاد مرحوم ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ظفر علی خاں سے ۵ سال اور اقبال سے ۹ سال چھوٹے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا۔ وہ ظفر علی خاں سے ۵ سال اور اقبال سے ۲۶ سال پیچھے اس دنیا سے اٹھ گئے وہ مغربی علم و ادب سے نا آشنا تھے۔ افلاس زدہ تھے کتابیں بھی میسر نہ آتی تھیں۔ مجبوری و معذوری عمر بھر دامن گیر رہی۔ ہر چند علوم و فنون کا خزینہ، فضل و کمال کا گنجینہ تھے مگر ان کے رتبے کے مطابق ان کی قدر نہ ہوئی بجز وہ خاص جس نے ان کے کلام کو حرز جاں بنا لیا وہ بھی ان کے لئے کچھ کر نہ پایا۔ افلاس سائے کی طرح ان کے ساتھ رہا۔ نان شبینہ کی فکر نے انھیں اٹھنے نہ دیا۔ تاجدار دکن اور جارج پنجم اور نواب رام پور کے حق میں بڑے زوردار قصیدے کہے۔ خاندانی نجابت و وجاہت مانع تھی۔ مانگنے کا بھی ڈھنگ نہ آیا اور پھوٹی کوڑی بھی نہ پائی۔

اس کے برعکس اقبال کو اقبال مندی کے سب ذرائع حاصل تھے۔ نوابوں سے یاری اور وظیفہ خواری میسر تھی۔ حکومت و سیاست میں دخل تھا۔ مانگنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ مداحوں کا ایک لشکر ان کا ڈھنڈورچی بنا ہوا تھا۔ ایک خاص طبقہ سیاسی وجوہ کی بنا پر انھیں ٹیگور کے مقابلے میں لانا چاہتا تھا۔"

آگے چل کر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اقبال کی شاعری تمام تر دوسرے شعرا کا چربہ ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:-

"یہی وجہ ہے کہ استاد کی کوشش اور ریاضت کے باوجود وہ قبول عام حاصل نہ کر سکے کیونکہ ان کے پاس سب کچھ ملنے مانگنے کا تھا۔"

اس طرح غالب کے سلسلے میں بھی قاصر صاحب کے خیالات شاہراہ عام سے ہٹ کر ہیں۔ وہ غالب کی فارسی شاعری کے تو معترف ہیں مگر ان کی اردو شاعری کے قائل نہیں ہیں۔

"مرزا جب خود کہتے ہیں کہ میرا اردو کلام مجموعۂ دو اس میں کیا رکھا ہے اور میرے فارسی کلام کو دیکھو کہ جلوۂ خوبیوں کا مرقع ہے تو پھر ہم کون ہیں کہ ان کی صائب رائے کو جھٹلائیں اور اپنی ناقص تاویل کو ٹھونسنے کی کوشش کریں۔"

ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"اس ضمن میں صرف شہرۂ آفاق اہل نقاد پدم بھوشن نیاز فتح پوری اور رئیس المتغزلین حضرت مولانا حسرت موہانی کے ارشادات پیش کرتا ہوں نیاز کہتے ہیں مومن پچیس جاؤ باقی سب اٹھا لو۔ حسرت ذوق کو غالب پر ترجیح دیتے ہیں ہر چند دونوں میں اختلاف ہے مگر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ غالب کو اپنے ہم عصروں پر فوقیت تو کجا برابری بھی حاصل نہیں ہو سکی۔"

قاصر صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ ہر اعتبار سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید ضیاء علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا